اسلامی شریعت میں پیشۂ وکالت کی حیثیت

تحریر۔ خادم حسین الٰہی بخش

ترجمہ: عصمت اللہ - رفقاء ادارہ معارف اسلامی منصورہ

وکالت عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں سپرد کرنا، تفویض کرنا، حفاظت و نگرانی کرنا اور اعتماد کرنا ہیں۔ قرآن مجید میں ہے "وَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا" یعنی ہم نے اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیئے ہیں۔ فقہی (قانونی) اصطلاح میں اس کا مفہوم اپنی سہولت اور آزمائش کی خاطر یا عجز و معذوری کی بنا پر شرعاً جائز اور معلوم تصرف میں کسی کو اپنا قائم مقام بنانا ہے[1]۔ بعض فقہا نے اس کی تعریف یوں کی ہے:۔ "تصرف کا شرعی حق رکھنے والے شخص کا کسی کو قابلِ نیابت اُمور میں اختیارات تفویض کرنا، جنہیں وہ مؤکل کی طرف سے زندگی میں استعمال کر سکتا ہو"[2]۔

وکالت کا جواز قرآن و حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ .....

(یعنی صدقات تو دراصل فقیروں، مسکینوں اور عاملینِ صدقات کے لیے ہیں"۔

---

[1] ردالمختار علی الدرالمختار۔ محمد بن عابدین ۴/۵۵۴ - اور اللباب نے شرح الکتاب۔ عبدالغنی الغنیمی ۲/۱۳۸ -

[2] مغنی المحتاج الی معرفۃ معانی المنہاج ۔

اور عاملینِ زکوٰۃ دراصل مستحقین کی طرف سے نائب کے طور پر صاحبِ نصاب لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عروہ بن بارقی کو ایک بکری کی خریداری، عمرو بن امیہ الضمریؓ کو ام حبیبہؓ کے نکاح اور ابو رافع رضی اللہ عنہ کو ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح میں اپنا وکیل مقرر کیا تھا۔

اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ ضرورت کی بنا پر وکالت فی الجملہ جائز ہے۔ اس لیے کہ ہر آدمی اپنے سارے ضروری کاموں کو از خود سرانجام دینے کی صلاحیت یا فرصت نہیں رکھتا۔ وکالت میں تصور میں چار چیزیں بنیاد کے طور پر شامل ہیں۔ ان کے بغیر وکالت مکمل نہیں ہوسکتی۔

۱۔ مؤکل ۲۔ وکیل ۳۔ مؤکل فیہ۔ یعنی جس کام یا غرض میں وکیل کو اختیارات دیئے گئے ہیں۔ ۴۔ صیغہ یعنی وکالت نامہ کے لیے قانونی الفاظ۔

موکل اور وکیل دونوں کا عاقل ہونا ضروری ہے۔ موکل کے لیے ضروری ہے کہ جس کام میں وہ وکیل بنا رہا ہے وہ اُسے خود کرنے کا اہل ہو۔ وکیل کے لیے ضروری ہے کہ اُسے اپنے وکیل بنائے جانے کا علم ہو نیز یہ کہ وکیل اور جس کام میں وکالت کے اختیارات دینے مقصود ہیں، دونوں کو معلوم ہوں۔ وکالت کا ثبوت مؤکل کے اقرار یا گواہوں کی شہادت سے ہوگا۔

وکالت دراصل ایک رضا کارانہ اور بلا معاوضہ معاہدہ ہے جسے محض انسانی اسباب اور معاشرتی حالات کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے۔ یہ گویا اپنے حق کے حصول کے لیے ایک ضرورت مند کے ساتھ رضا کارانہ تعاون کی ایک شکل ہے جس میں اُجرت اور فیس لینا اس کے بنیادی رُوح کے خلاف ہے۔

یہ کوئی فن یا ہنر بھی نہیں جس کو روزی کمانے کا ذریعہ بنایا جا سکے۔ انہی وجوہ کی بنا پر ردالمحتار کے مصنف فرماتے ہیں کہ عقدِ وکالت ایک امانت ہے، جس کو فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اکثر فقہا کی رائے ہے کہ ایک مقرر اور طریقین

(موکل اور وکیل) کو معلوم اجرت و فیس پر وکیل بنانا درست ہے۔ اور وکیل جب طے شدہ ذمہ داری کو پورا کر دے تو وہ اجرت کا حق دار ہے۔ اور اگر اجرت پہلے طے نہ کی گئی ہو یا بعد میں معلوم ہو کہ عقد وکالت شرعاً فاسد تھا تو وکیل کو عرفِ عام کے مطابق اس کام کی اجرت ملے گی۔

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ یہ حقوق میں نیابت جائز ہے۔ ان میں وکالت بھی درست ہے۔ جن چیزوں میں موکل کے لیے کوئی فائدہ یا مصلحت ہو۔ انہی میں اُسے اختیارِ وکالت استعمال کرنے کا حق ہے۔ اور جس کام میں مؤکل کے لیے کوئی مصلحت نہ ہو۔ وکیل شرعاً ایسے اُمور میں معزول تصور ہوگا۔ اسی بنا پر خالص بدنی عبادات (مثلاً نماز)..... غلام کی آزادی و ظہار، لعان میں وکالت جائز نہیں۔

جملہ اُن حقوق کے جن میں نیابت و وکالت جائز ہے۔ ایک حقِ خصومۃ ہے یعنی دو آدمیوں میں کسی حق میں تنازع و تکرار۔ چونکہ یہ حق خصومۃ تمام قابلِ نزاع انسانی معاملات کو شامل ہے۔ اس لیے فقہاء..... اللہ تعالیٰ نے فریقین مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان تمام متنازعہ اُمور میں وکالت کو جائز قرار دیا ہے، البتہ یہ بات ابتداء میں بھی سمجھ لینے کی ہے کہ وکالت ایک عام چیز ہے، جس کو نیابت کے مفہوم میں ہم لے سکتے ہیں۔ اور یہ تمام معاملات حتیٰ کہ بعض عباداتِ مالیہ یا عبادات مرکبہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً زکوٰۃ اور حج میں۔ البتہ وکالت بالخصومۃ اس کی ایک قسم ہے جو صرف فریقین میں اختلاف و تنازع کی صورت میں ہوگی۔ اور چونکہ آدمیوں میں تنازعہ و جھگڑا صرف حقوق العباد اور اس کے متعلقات میں ہو سکتا ہے۔ اس لیے تمام عبادات اور حقوق اور وکالت بالخصومۃ سے مستثنیٰ ہوں گے۔ موجودہ عدالتوں میں رائج وکالت فقہائے اسلام کی وکالت بالخصومۃ کی ایک:

تمام فقہاء اسلام اس بات پر متفق ہیں۔ حدود اللہ میں سے حدِ زنا اور حدِ شربِ خمر میں ملزم کی جانب سے وکالت درست نہیں۔ اور ان دو حدود میں وکالت

ایک ایسا..... لا یعنی کام جس کے باطل ہونے پر اُمتِ مُسلمہ کا اتفاق ہے۔ نیز یہ کہ حد کو ٹالنا اور مجرم کو تحفظ مہیا کرنا ہی نیابت شریعت کے منافی ہے، اس لیے حدود اللہ تعالیٰ کا حق ہیں اور جب ان کے جرائم کا ارتکاب ہو جائے تو جائے تو حد کی تنفیذ کے ذریعے حقوق اللہ کی حفاظت ضروری ہوتی ہے اور وکالت چونکہ ان حقوق میں جائز ہے جو قابلِ نیابت ہوں اور حدود قابلِ نیابت نہیں ہیں۔

فقہ حنفی کی معروف کتاب "بدائع الصنائع" کے مصنف امام کاسانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

"جن حدود میں خصومت، فریقینِ مقدمہ کے درمیان زبان تنازع و تکرار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً حدِ زنا اور حدِ شرب، ان کے اثبات میں وکالت درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ حدود قاضی کے سامنے گواہوں کی شہادت یا ملزم کے اقرار سے ثابت ہو جاتی ہیں، خصومت کی ضرورت نہیں ہوتی"[1]

تکملہ فتح القدیر کے مؤلف لکھتے ہیں "یہ جان لینا ضروری ہے کہ جو لوگ حدود کے اثبات میں وکالت کو جائز قرار دیتے ہیں، اُن کے نزدیک حدود سے مراد صرف حدِ قذف اور حدِ سرقہ ہوتی ہے۔ اسی لیے حدِ زنا اور حدِ شرب کے اثبات میں کسی کو وکیل بنانا باتفاق فقہاء جائز نہیں۔ اس لیے کہ ان میں حق العباد نہیں ہے"[2]

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض فقہائے سلف فرماتے ہیں کہ ملزم کی جانب سے وکالت تمام حدود — سرقہ، قذف، حرابہ، زنا، شرابِ خمر — میں جائز نہیں اور ان تمام حدود کے مقدمات کی تفتیش و تحقیق اور سماعت میں صرف قاضی یا اس کا نائب اور ملزم شریک ہوں گے۔

فقہاء نے اپنی اس رائے کے لیے ان مقدماتِ حدود کو اساس و دلیل بنایا ہے جو

---

[1] بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۱

[2] تکملہ شرح فتح القدیر ۷/۸

عہدِ رسالت نبی کریم کے سامنے پیش ہوئے۔

مثلاً حدِ زنا کے متعلق ایسے مقدمات ملتے ہیں جو موجودہ رائج غیر اسلامی قوانین اور اس کے ماہرین کی نظر میں وکالت کے مستحق تھے۔ لیکن ہمیں کہیں بھی وکالت یا وکیلوں کا وجود نہیں ملتا۔

— ماعز بن مالک اسلمی کا قصہ جو نعیم بن ہزال کی زیرِ پرورش ایک یتیم تھے[1]

— قبیلہ جہینہ کی حاملہ عورت کا واقعہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "یارسول اللہ! کیا آپ مجھے بھی اسی طرح لوٹانا چاہتے ہیں جیسے ماعز کو واپس کر دیا تھا، بخدا میرے پیٹ میں — زنا کا — حمل موجود ہے"[2]

— مشہور واقعہ عسیف (مزدور) جب اُس سے زنا کا ارتکاب ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انیس اسلمی کو یہ ہدایت دے کر عورت کی طرف بھیجا کہ اگر وہ اعتراف کرلے تو اس کو "رجم" سنگسار کرنے کی سزا دینا۔

اِن مقدمات پر غور کرنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ عورت اپنی کمزوری اور حیا و پردہ داری نیز اپنے مقدمہ کی خود پیروی کرنے سے عجز و معذوری کی بنا پر کسی کو اپنا وکیل بنانے کا معقول جواز رکھتی تھی۔ اور وہ یتیم و بے سہارا بچہ جو باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم تھا، اس بات کا سب سے زیادہ مستحق تھا کہ اس کے ساتھ ہمدردی و شفقت اور احسان کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ اس سے بڑی اور شفقت کیا ہو سکتی تھی کہ ایک ایسے مقدمہ میں اس کی مدافعت و وکالت کا انتظام کیا جائے جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

اگر حدِ زنا کے ملزم کی جانب سے وکالت کی گنجائش اسلامی قانون میں موجود ہوتی تو حضورؐ اکرم اس مقدمہ میں عورت کے اعزا یا خاندان کے لوگوں میں سے کسی کو اس

---

[1] سنن ابوداؤد ۲/۴۵۶

[2] سنن ابوداؤد ۲/۴۵۹

کی طرف سے وکیل بننے کی ہدایت فرماتے۔ اس لیے کہ اسلام ایسے اُمور میں پردہ پوشی اور اخفاء کی ترغیب دیتا ہے۔ ایسے ہی ایک خاتون اس بات کی سب سے زیادہ ضرورت مند تھی کہ کوئی اس کا وکیل بن کر اس کی طرف سے دفاع کرے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتبِ احادیث میں اس آدمی کا قصہ نقل ہوا ہے جس نے ارتکابِ زنا کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں اعتراف کرتے وقت (فریقِ ثانی) عورت کا نام لیا تو آپؐ نے کسی کو بھیج کر تحقیق کروائی، اُس نے اعترافِ جرم سے انکار کر دیا تو آنحضرتؐ نے اقبال کرنے والے پر حد جاری کی اور عورت کو چھوڑ دیا۔

حضرت سہل بن سعد فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضورؐ کے پاس آکر اعتراف کیا کہ اس نے ایک عورت (جس کا اس نے نام لیا) کے ساتھ زنا کیا ہے تو آپؐ نے عورت سے اس بارے میں معلوم کروایا۔ جب اُس نے صاف انکار کر دیا تو آپؐ نے اقرار کرنے والے کو کوڑوں کی سزا دینے کا حکم دیا۔ اور جس عورت کا اس نے نام لیا اُس کو چھوڑ دیا گیا۔[1]

اسی طرح آپؐ نے اس عورت کی طرف جس کے ساتھ ایک گھر میں کام کرنے والے مزدور نے زنا کیا تھا، انیس کو روانہ کیا اور اس عورت کے خاوند کو توجہ میں نہ لائے جو اپنی عزت کی پردہ پوشی، خاندان کو بکھرنے سے بچانے اور ازدواجی زندگی کی بقا کی خاطر اس کی طرف سے وکالت کا حق دار بنتا تھا۔

اِن مقدمات کی رُوداد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اقبال کرنے والے نے اگر فریقِ ثانی کا نام لیا تو آپؐ نے اس سے تحقیق کی۔ اور اگر اعتراف کرنے والے نے کسی کا نام نہیں لیا تو آپؐ نے صرف اعتراف کرنے والے پر حد جاری فرمائی اور مزید کھوج کرید میں پڑنے سے اجتناب کیا۔ قبیلہ جہینہ کی عورت کا واقعہ اس کی واضح دلیل ہے۔ نیز حضرت سہل بن حنیف بعض انصاری صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں، کہ اُن کا

[1] سنن ابوداود ج ۲ ص ۲۶۳

ایک آدمی ہوا اور سخت کمزور ہو گیا۔ دیکھنے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پاس کسی کی لونڈی گئی، تو وہ اس کے ساتھ زنا کا ارتکاب کر بیٹھا۔ جب اس کے قبیلہ سے کچھ لوگ اُس کی عیادت کرنے آئے تو وہ ندامت کے مارے ان کو بتانے لگا کہ میرے معاملہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ ایک سو ت خوں والی جھاڑن لے کر اس کو ایک ہی ضرب مار دی جائے۔[1]

کہا جاتا ہے کہ یہ پوچھنے والے اس کے وکیل ہی تو تھے۔ "حنیف" کے والد بھی اس کی طرف سے اقرار میں وکیل تھے۔ اسی لیے دعویٰ کا انکار کرنے میں بھی وکالت درست ہوگی۔ کیونکہ اقرار اور انکار دونوں دعویٰ کا حصہ ہیں۔

لیکن بنظرِ تامل دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ لوگ اعترافِ جرم کرنے والوں کی طرف سے وکیل نہیں، بلکہ پیغام بر تھے۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرعی حکم معلوم کرنے آئے تھے، جسے نافذ کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ واقعۂ عسیف میں عورت کے شوہر نے اس کا دفاع نہیں کیا۔ اسی طرح قبیلۂ جہینہ کی حاملہ عورت کے متعلق بات جب اس کے اقرار کے بعد مشہور ہو گئی تو کسی نے اس کی پردہ پوشی اور مدافعت کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ دونوں مقدمات میں بظاہر وکالت و دفاع کی سخت ضرورت تھی اور رحمت و شفقت کا تقاضا تھی۔

(باقی)

---

[1] سنن ابوداؤد ج ۲ ص